اُردو میں غرور کے معنی میں بولتے ہیں وہ لفظ غِرّہ بکسر اوّل ہے۔ اس کے اصل معنی ہیں دھوکا فریب، غفلت، سادہ لوحی۔

غریب۔ عربی فارسی میں مفلس و نادار کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ اس معنی میں صرف اُردو میں ہے۔ اور نیک و شریف کے معنی میں تو کہیں نہیں بولا جاتا ممکن ہے دیہاتی لوگ بولتے ہوں۔

عربی میں اس کے معنی ہیں پردیسی، اپنے گھر سے دُور۔ فارسی میں پردیسی، اجنبی، بیگانہ کے معنی میں آتا ہے جو لوگ اس کا ترجمہ مسافر کرتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں۔ ایک حدیث ہے :۔

كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ یعنی دُنیا میں اس طرح رہو جیسے تم پردیسی ہو یا راہ رَو۔

کاٹ۔ لکڑی کے معنی میں کاٹھ ہے۔ کاٹ نہیں۔ کاٹھی، کٹھ پتلی، کٹھ حجت وغیرہ الفاظ اسی سے بنے ہیں۔

ماوا۔ جس ماویٰ کے معنی ہیں "جائے پناہ" وہ عربی لفظ ہے۔ اور بالف مقصورہ (بشکل ی) ہے۔ جنتہ الماویٰ۔ اس کو بالف نہیں لکھا جائے گا۔ ہاں اگر اس سے یائے وحدت ملے گی یا وہ خود مضاف بنے گا تو الف سے لکھا جائے گا جیسے ماوائے ندارم، ماوائے انام۔ کھویے کے معنی میں ماوا ہندی لفظ ہے اس کو الف ہی سے لکھنا چاہیے۔ یہ یاد رہے کہ لفظ "جائے پناہ" کو بغیر "ے" کے صرف ہمزہ سے "جاء پناہ" لکھنا غلط املا ہے۔ اس کے بارے میں بحث دیکھو "ادبی بھول بھلیاں" ص ۱۱۹

عنوان نمبر ۱۸

"متعدد اعراب یا املا سے صحیح الفاظ"

بشارت۔ اُردو میں صرف بفتح اوّل بمعنی مژدۂ و خوش خبری مستعمل ہے۔

پتہ۔ نام ونشان کے معنی میں ہو تو ہائے مختفی لکھنا چاہیے۔ اور اسی طرح ہندوستانی فارسی میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ اور برگ اور زہرہ کے معنی میں ہو تو "ت" مشدد ہوگی اور آخر میں الف ہوگا۔ املا میں مابہ الامتیاز یہی الف ہے۔ برگ کے معنی میں بفتح اوّل اور زہرہ کے معنی میں بکسر اوّل۔ (باقی آئندہ)

اعلان

حضرت مفتی صاحبؒ کے سلسلے میں جو خاص نمبر شائع ہوتے جا رہا ہے اس کی تاخیر کی اصل وجہ حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحبؒ ایڈیٹر رسالہ برہان کی طویل علالت رہی اور اب انشاء اللہ تعالیٰ میری یہ کوشش رہے گی کہ یہ شاندار معیاری نمبر حضرت مفتی صاحبؒ کے شایانِ شان بہت جلد شائع ہو اور حضرت مفتی صاحبؒ کے نام سے ایک اکیڈمی قائم کی جائے اور ان کی میموریل سوسائٹی یقیناً بننی چاہیئے اور مفتی عتیق الرحمٰنؒ روڈ جامع مسجد کے علاقے میں قائم کی جائے۔ اس لئے دہلی اور باہر کے حضرات حضرت مفتی صاحبؒ کے معتقدین اور محسنین سے اپیل کرتا ہوں کہ اس معاملے میں پوری دلچسپی لیں۔ میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ شکریہ!

نوٹ: حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ کے جتنے بھی خطوط آپ کے پاس ہوں اُن کے ذخیرہ کو جمع کر کے اس نکلنے والے شاندار نمبر میں شامل کریں تاکہ اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو۔

خادم: عمید الرحمٰن عثمانی۔ منیجر رسالہ برہان دہلی

جدید عربی نثر نگاری کے ارتقائی مراحل

ڈاکٹر محمد راشد ندوی

(۱)

اُنیسویں صدی کے اواخر سے آج تک عربی نثر میں جو عظیم الشان تدریجی ارتقا ہوا ہے اس سے ہم اس کی وسعت اور لچک کا اندازہ کر سکتے ہیں کسی زبان کی عظمت کا صحیح اندازہ اس کا مختلف حالات سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت سے کیا جا سکتا ہے کیونکہ فکرِ انسانی میں تسلسل کے ساتھ ساتھ جو اُتار چڑھاؤ ہوتا ہے وہی درحقیقت انسان کی غیر معمولی فطری صلاحیتوں کی غمازی کرتا ہے اور جس لمحہ اس میں سکون، خاموشی اور ٹھہراؤ پیدا ہو جائے اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ عروج کی منزلوں کو طے کر کے زوال کی راہ پر گامزن ہے اس لئے فکرِ انسانی کے ارتقائی اور انحطاطی مراحل کی داستان تاریخی صحیفوں سے زیادہ زبان و ادب کے ذخیرہ میں دیکھی اور پڑھی جا سکتی ہے۔

زبان کے خط و خال، اس کے لفظوں کی لہروں میں جو تلاطم اور ہیجان پیدا ہوتا ہے کبھی وہ جوش و ولولہ اور کبھی کسی بیکس کی آہ و فغاں کی غمازی کرتا ہے۔ ان کے الگ الگ ساز و نغمے ہوتے ہیں لیکن دونوں کے اثرات قلب و جگر پر یکساں ہوتے ہیں۔ صرف فرق اتنا ہوتا

ہے کہ ایک کو پڑھ کر قدم آگے بڑھنے لگتے ہیں اور دوسرے کو پڑھ کر آنسوؤں کے بادل ہیں دنیا تاریک ہو جاتی ہے اور آگے کی منزل تو درکنار اپنے قدم کے نیچے کی زمین کا پوری طرح اندازہ بھی نہیں ہو پاتا۔ اس لئے جوش وولولہ کے ساز عام طور سے نشاۃ ثانیہ کے مراحل میں سُنائی دیتے ہیں جہاں تک فکر وخیال میں پختگی واستحکام کا تعلق ہے اس کو میں صرف وہم وگمان پر محمول کرتا ہوں۔ کیونکہ انسانی تاریخ میں فکری ارتقاء کے جو مراحل ہمیں ملتے ہیں اس کی ہمیں کوئی بھی حد اور متعین منزل نظر نہیں آتی کیونکہ ہر مرحلہ دوسرے مرحلہ سے مختلف نظر آتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت نہیں ہوتا بلکہ جوں جوں زمانہ گذرتا ہے اس کو نقد کی کسوٹی پر آسانی سے پرکھا جا سکتا ہے۔ اس سے زبان وبیان کے ارتقاء کی کوئی منزل نہیں ہوتی بلکہ ایک مرحلہ دوسرے مرحلہ سے اس طرح مربوط اور وابستہ ہوتا ہے جس طرح سمندر اور طوفانی دریاؤں کی لہریں ایک دوسرے سے بظاہر الگ ہوتی ہیں لیکن درحقیقت دونوں میں ایسا گہرا اور عمیق ربط ہوتا ہے کہ اگر ایک موج کسی منزل میں رُک جائے تو دوسری خود بخود بے سہارا ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔ اس لئے زبان وادب کی ترقی کا معیار ربط وتسلسل، حرکت وروانی میں ہے نہ کہ ٹھہراؤ وسکون میں میں اپنے اس مقالہ میں مختصر طور پر جدید عربی زبان کے اسالیب وبیان اور ارتقائی مراحل پر اپنے حقیر تاثرات پیش کرنے کی جرأت کروں گا۔

جدید عربی نثر کی عمر بہت طویل نہیں ہے۔ اس لئے اس کو مختلف مراحل اور مختلف دائروں میں آسانی سے محصور کیا جا سکتا ہے اور ہر دائرہ اور ہر مرحلہ کی جو خصوصیات ہیں انھیں آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

جمال الدین افغانی:۔ جدید عربی نثر کی صحیح معنوں میں ابتداء انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوتی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب مصر اور دوسرے عرب ممالک یوروپ کے فکر وفلسفہ، سیاست، واجتماع، ثقافت وتہذیب سے آشنا ہو چکے تھے۔ غلامی وآزادی علم وجہالت، عدل وظلم، حق وباطل کے سیاسی اور اخلاقی حدود سے انھیں کچھ واقفیت ہوئی

شروع ہوچکی تھی ۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تردد نہیں کہ یہ مختلف اصطلاحیں انھیں یورپ سے ملی تھیں۔ اس وقت تک زیادہ تر لوگ اپنے شاندار ماضی کے ورثہ سے نابلد تھے اس لئے میں اس دور کو نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کرسکتا ہوں کیونکہ قوموں کے لئے نشاۃ ثانیہ کے جو ارکان ہوسکتے ہیں اس وقت عرب ممالک میں خاص طور سے مصر میں بڑی حد تک موجود تھے ۔ اور سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نشاۃ ثانیہ میں ایک عجیب و غریب معجزہ نظر آتا ہے وہ یہ کہ ایک لحن عجمی کا پروردہ فرزند عربی ساز کا ایسا گرویدہ ہوجائے کہ اپنے نغموں سے دلوں کو موہ لے اور اپنی زبان کی طاقت سے دلوں پر حکومت کرنے لگے وہ فرزند شیخ جمال الدین الافغانی کے نام سے مشہور ہے ۔ افغانی کی شخصیت جس کا نام ہی عزم و حوصلہ، جہاد و قربانی کا رمز تصور کیا جاتا ہے وہ افغانستان میں ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے ۔ ان کا خاندان افغانستان کے شرفاء میں تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ان کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم افغانستان میں ہوئی ۔ ان کے تذکرہ نگاروں نے اُن علوم کی نشاندہی کی ہے جن کو انھوں نے افغانستان میں پڑھا تھا اور یہ تقریباً وہی علوم ہیں جو عام طور سے ممالکِ اسلامیہ کے مدارس میں رائج تھے اور یہ علوم ۔ علوم شرعیہ، علوم عقلیہ، الجبرا اور ریاضیات کے مبادی، تاریخ و سیرت اور علوم عربیہ ہیں ۔ یہ وہ علوم ہیں جن کو طلباء حاصل کرکے مدارس میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے ۔ یہ علوم اپنی جگہ تعلیم و تدریس کے لئے مناسب تھے لیکن انھیں پڑھانے کے جو طریقے رائج تھے ان میں مردم سازی کی اسپرٹ بالکل نہیں پائی جاتی تھی ۔ کیونکہ طلباء یہ علوم حاصل کرلیتے تھے عام طور سے ان میں سیاسی، سماجی اور یہاں تک کہ مذہب کا بھی صحیح شعور نہیں پیدا ہوتا تھا ۔ لیکن قدرت کو افغانی کے ہاتھوں اپنا کرشمہ دکھانا تھا۔ افغانستان کا یہ فرزند جس کی مادری زبان فارسی تھی ، عربی تعلیم کو افغانستان جیسے پچھڑے ہوئے ملک میں حاصل کیا تھا۔ یقین نہیں ہوتا کہ ۱۸ سال کی عمر میں اپنے تعلیمی مراحل کو طے کرکے سیاست و ثقافت کا مرکز اور محور بن جائے گا اور طائر لاہوتی کی طرح اپنا آشیانہ بلندیوں پر بنائے گا

جس کا اس زمانہ میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ افغانستان کی سیاسی اور سماجی زندگی اس کی نگاہوں میں کھٹک رہی تھی اس لئے اس نے اس کی اصلاح کی طرف قدم بڑھایا لیکن ایسا لگتا ہے کہ ابھی اس نے اپنے قدم اٹھائے بھی نہیں تھے کہ وہ زنجیروں کے اسیر ہو گئے اور اس نے زبان کو حرکت بھی نہیں دی تھی کہ اس کا منہ بند کر دیا گیا لیکن اس نے حالات سے مصالحت نہیں کی اگر مصالحت کر لیتے تو خاندانی جاہ و جلال اور عزت و شرف کو بظاہر آگے بڑھاتے اور اپنی ذاتی صلاحیت اور ذہانت کی بدولت اپنے وطن میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے لیکن بقول اقبالؒ ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ۔۔۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

افغانی طائر لاہوتی کی طرح اپنے وطن سے نکل پڑے۔ ان کی کیا منزل تھی شاید اس وقت ان کو اس کی خبر بھی نہیں رہی ہوگی کیونکہ ان کا مقصد نہ تو حصول رزق تھا اور نہ حصول جاہ بلکہ اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے پرواز میں آتی ہے کوتاہی' کے داعی اور مبلغ بن گئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ اپنے وطن عزیز میں ان کے بال و پر میں بجائے نمو و طاقت کے جمود و ضعف پیدا ہو جائے گا اس لئے وہ وہاں سے نکل پڑے، ان کے دل میں مخلوقِ خدا کی خدمت کا جذبہ موجزن تھا۔ اُمّتِ اسلامیہ کی بدحالی اور پستی پر انھیں قلق و رنج تھا اور خود کو وہ اس خدمت کے لئے وقف کرنا چاہتے تھے لیکن اپنے کام کا مرکز کہاں بناتے' اس پر وہ سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ افغانستان کا انھوں نے تجربہ کر لیا تھا۔ ادھر ہندوستان کے حالات کا بھی انھیں یقیناً علم تھا مغلیہ سلطنت کے قصرِ عالی کے کنگورے ایک ایک کر کے زمین پر آ رہے تھے یا آ چکے تھے اور طوائف الملوکی کے بھیانک انجام سے بھی وہ باخبر تھے اور ملک غیر ملکی طاقتوں کا نشانہ بن چکا تھا۔ سرزمین نجد و حجاز میں کسی بھی اصلاحی کام کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک سے سلطنتِ عثمانیہ میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا اور اس کے دبانے میں انھیں ہر امکانی کوشش کرنی پڑی۔ اس لئے کوئی بھی اصلاحی تحریک بلکہ مذہبی تحریک بھی شکوک کی نگاہوں سے دیکھی جا سکتی تھی۔ شام، عراق، فلسطین،

یہ علاقے دولتِ عثمانیہ کے ماتحت تھے اس لئے یہاں بھی کوئی اصلاحی کام ناممکن تھا بقول علامہ کرد علی:-

"شام کے علاقہ میں ہر اصلاحی کام پر بڑی آسانی سے وہابیت کا لیبل چپکایا جاسکتا تھا۔ بلکہ آزادیٔ فکر و آزادیٔ خیال کو بھی ترکی حکام وہابیت کے نام سے موسوم کرتے تھے اس لئے جو بھی اصلاحی کام کے لئے قدم آگے بڑھاتا وہ ہر سزا کا سزاوار ہوسکتا تھا"۔

ان حالات میں افغانی کے سامنے صرف مصر ہی تھا، جہاں دوسرے عرب اسلامی ممالک کے مقابلہ میں آزادیٔ خیال کی گنجائش تھی اور دوسرے، مصر اور خاص طور سے قاہرہ شہر دنیائے عرب کا سب سے بڑا سیاسی، مذہبی اور علمی مرکز تھا۔ جمال الدین الافغانی نے وادیٔ نیل ہی کو اپنی اصلاحی سرگرمیوں کے لئے پہلی منزل متعین کیا۔ چنانچہ خدیو اسمٰعیل کے زمانہ مارچ ۱۸۷۱ء میں وہ مصر آئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۳۲ سال تھی۔ اور آٹھ سال مسلسل قیام کیا۔ پروفیسر عمر الدسوقی، افغانی کے مصر میں آمد کو ایک تاریخی واقعہ سے تعبیر کرتے ہیں وہ اپنے خاص ادبی انداز میں لکھتے ہیں:-

"فقدم السید جمال الدین مصر ودخلها فی مارس سنة ١٨٧١م ومکث بها ثمانی سنوات کانت من خیر السنین برکة علی مصر وعلی الشرق الاسلامی، فقد حاول جمال الدین الافغانی من قبل ان یغرس تعالیمه وینفخ فی الشعوب الشرقیة روحه ولکن وجد ارضا مجدبة وشعوبا میتة لم تسمع لنداءه دما ان نزل مصر حتی فتحت له ذراعها وجبت له الاقامة فیها والتف حوله لفیف من ابنائها من کل طواق للحریة ومحب للعلم حریص علی نفع وطنه وانهاض قومه وتجاوبت روحه روحهم وجذ وا

فيه المعلم الفذ المفكر الجرئ صاحب العقل المستقيم ووجد فيهم تلامذة بررة وعقولا خصبة ونفوساً تتحرك شوقا للحرية والادب"(۱)

جمال الدین افغانی مصر آئے۔ اگرچہ مصر میں وہ پابندیاں نہیں تھیں جو دوسرے ممالک اسلامیہ میں تھیں لیکن اپنے مشن کے لئے کون سا دائرہ متعین کرتے بلکہ بات کہاں سے اور کیسے شروع کرتے معاملہ اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ پروفیسر عمر الدسوقی نے فرمایا کیونکہ مصر اگرچہ دولت عثمانیہ سے آزاد تھا لیکن امور خارجہ میں اس کا پابند تھا۔ دوسرے دولت عثمانیہ کا اخلاقی اور سیاسی دباؤ مصر پر ہمیشہ رہا۔ ادہر عوام اور حکومت میں تال میل نہیں تھا۔ محمد علی کے خاندان والوں سے مصری عوام بہت بیزار تھے۔ ترکی اور چرکسی خاندان والوں کے احساس برتری نے عوام کے دل و دماغ کو بے چین کر دیا تھا۔ خدیو کی انانیت اور اسراف نے حکومت کو غیر ملکی کمپنیوں کا تقریباً غلام بنا دیا تھا اور حکومت فرانس اور برطانیہ کی حکومت اس قدر مقروض تھی کہ مطالبہ کی ادائیگی محال معلوم ہو رہی تھی اور اس کی وجہ سے حکومت مصر نے برطانیہ اور فرانس کو اپنے اہم معاملات میں دخیل بنا دیا تھا جن کی مشیروں اور وزیروں کی مرضی کے خلاف خارجہ اور داخلہ پالیسی میں کوئی اقدام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہر صورت ان نازک حالات میں افغانی کو مصر میں اتنی آزادی حاصل نہیں تھی جتنی کہ اس وقت کے ادباء اظہار کرتے ہیں۔ وہ اس ملک کے باشندے نہیں تھے اس لئے انھیں اور بھی قدم پھونک پھونک کر اٹھانے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید جمال الدین افغانی جتنے جری اور بیباک تھے اتنے ہی وہ سوجھ بوجھ والے بھی تھے کیونکہ ایک نئے ماحول میں زمین ہموار کرنا اور لوگوں کے دل و دماغ کو موہ لینا، اس میں جذبات سے زیادہ ذہانت درکار ہوتی ہے۔ افغانی نے مصر میں جو طریقۂ کار استعمال کیا وہاں ان کی عظمت کے

---

(۱) فی الادب الحدیث ص ۲۲۱ ط ۲ عمر الدسوقی

ساتھ ساتھ ان کی سوجھ بوجھ کا بھی اندازہ ہوتا ہے کیونکہ آٹھ سال کی مدت میں ان کا نام مصر کے بچہ بچہ کی زبان پر تھا اور ہر گروہ اور ہر طبقہ کے لوگوں نے متفقہ طور پر انھیں اپنا استاد قرار دیا۔ سید جمال الدین افغانی کی اسلامی علوم عربی زبان و ادب، تاریخ و فلسفہ پر کیسی نظر تھی یہ مسئلہ قابل غور ہے لیکن یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے جو کچھ پڑھا تھا اس کو ہضم کر لیا تھا چنانچہ مصر پہنچ کر سب سے پہلے وہ ایک ہوشمند معلم کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ مصر کے علماء اور ازہر کے شیوخ کے معلم اور مربی بن گئے۔ لوگوں نے ان کے طریقۂ تدریس و تعلیم میں ایک نئی چیز پائی وہ طلباء میں کتاب خوانی سے زیادہ کتاب فہمی پر زور دیتے اور کتابوں کے متون میں الجھنے کے بجائے ان کے مسائل کو نئے انداز میں سمجھنے اور اس سے مسائل کے استنباط و استمزاج میں وہ طریقہ استعمال کرتے جس سے طلباء میں علمی ذوق اور شوق پیدا ہوتا اور پڑھاتے وقت ہلکے انداز میں کبھی کبھی طلباء کے سامنے دنیا کے مسائل اور خاص طور سے امتِ اسلامیہ کے مسائل کی طرف توجہ دلاتے۔ اس طرح طلباء میں آہستہ آہستہ علوم سے دلچسپی اور حالاتِ حاضرہ سے واقفیت پیدا ہوئی۔ آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے تعلیمی حلقہ کو وسیع کرنا شروع کیا۔ جامع ازہر کے علاوہ وہ اپنی قیام گاہ پر بھی ملک کے ہونہار نوجوانوں کو بلاتے اور انھیں اپنی فکر سے باخبر کرتے۔ اس کے بعد انھوں نے خواص کے علاوہ عوام سے بھی رابطہ پیدا کرنا شروع کیا۔ اور یہ رابطہ قاہرہ کے قہوہ خانوں کے ذریعہ سے شروع ہوا۔ شام میں ان کی مجلسیں ہوتیں جن میں وہ مختلف مسائل پر گفتگو کرتے۔ اب ان کا اندازِ بیان بھی آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ ان مجلسوں میں وہ جذبات سے کام لیتے تاکہ لوگوں کے دلوں کو گرما دیں۔ اس طرح ایک کامیاب معلم، ایک اچھے اور مؤثر مقرر کے روپ میں لوگوں کے سامنے آیا مصر میں جمال الدین افغانی کو فن خطابت کا بھی موجد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب ان کا دائرۂ فکر اور دائرۂ عمل وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا جن میں وہ لوگوں کو ان کے شاندار ماضی سے باخبر کرتے اور ان کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرتے پھر دنیا میں جو عدل و قانون کی فضا پیدا ہو رہی تھی اس فضا سے بھی عوام کو باخبر کرتے۔ بقول

شیخ محمد عبدہ :

"افغانی کی بدولت مصر میں لوگوں نے عدل و انصاف، اخلاق، قانون اور حقوق، سیاست اور ثقافت کے مفہوم کو سمجھا۔ ورنہ ان سے پہلے لوگوں کے ذہن میں یہ بات بھی نہیں آتی تھی کہ قانون اور حقوق کیا ہیں۔ عوام اور حکام کے درمیان کیسا رشتہ ہونا چاہیئے۔ اطاعت کا کیا مفہوم ہے۔ یہ باتیں مصر کے لوگوں کے لئے بالکل نئی تھیں۔ جب انھوں نے حکیم مشرق کی زبان سے یہ باتیں سُنیں تو انھیں تاریک راتوں میں روشنی کی کرنیں نظر آنے لگیں اور آہستہ آہستہ وہ علم و عرفان کی حقیقی روشنی سے ہمکنار ہونے لگے۔"

ان باتوں کو انھوں نے لحن عجمی کے پروردہ سے فصیح و بلیغ عربی زبان میں سُنا۔ اس لئے اس میں اور زیادہ اثر تھا۔ افغانی نے جہاں سیاسی اور سماجی مسائل پر وہیں اُنھوں نے قومی اور ملکی زبان میں مہارت حاصل کرنے پر بھی زور دیا۔ غیر ملکی زبانوں کے سیکھنے اور اس میں وسعت پیدا کرنے کے وہ مخالف نہیں تھے بلکہ ان کا یہ خیال تھا کہ ان کے سیکھنے اور جاننے سے قومی زبانوں میں وسعت اور ثقافت و تہذیب میں تنوع پیدا ہوگا اور یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جب عوام کا سیاسی اور قومی شعور صحیح معنوں میں بیدار ہو۔ آباؤ واجداد کے علمی و ادبی ورثہ پر انھیں ناز و فخر ہو اور اگر ان کا قومی اور سیاسی شعور کمزور اور مضمحل ہوگا تو غیر ملکی زبانیں اور ان کی تہذیبیں عوام تو درکنار خواص کو بھی اپنے دھارے میں بہا لے جائیں گی۔ ان نظریات و افکار کا وہ اپنے تدریسی حلقہ سے لے کر عوامی مجلسوں میں اظہار کرتے جس کی بدولت مصر کا ایک مخصوص طبقہ ان نظریات کا حامل اور علمبردار بن گیا۔ اُن کے اِن نظریات سے عوام اور خواص کو جہاں فائدہ پہنچ رہا تھا وہیں مصر کے حکام بلکہ قسطنطنیہ کے ارباب حل و عقد اس سے گھبرا رہے تھے کیونکہ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر عوام میں صحیح علمی سیاسی اور سماجی شعور بیدار ہوگیا تو ان کی حکومت کے قصر عالی کی دیواریں متزلزل ہو جائیں گی اور ان کی آمریت کے تمام ذرائع اور وسائل خس و خاشاک کی طرح ہوا میں اُڑ جائیں گے۔ چنانچہ اُنھوں نے اس

طائر لاہوتی کو آزاد اور کھلی فضاؤں سے اُڑا کر سونے کے قفس میں اسیر بنانے کا فیصلہ کر لیا اور وادیٔ نیل سے انھیں اُڑا کر دوسری جگہ لے گئے اور یہ سوچ کر انھوں نے یہاں سے اُڑایا کہ اس بلبل شادی کے نغموں کو لوگ بھول جائیں گے لیکن ان کا یہ خیال ہر اعتبار سے غلط ثابت ہوا کیونکہ ان کے نغمے فضاؤں میں گونج رہے تھے اور جو کان اُن سے آشنا ہو گئے ان کو کبھی بھی فراموش نہ کرتے کیونکہ وہ دل کی گہرائیوں تک اُتر چکے تھے۔

افغانی کے نظریات و افکار وادیٔ نیل ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ اس کی صدائیں دجلہ و فرات کے کناروں تک پہنچ رہی تھیں اور قسطنطنیہ کے ایوان شاہی میں بھی اس کی بازگشت تھی اس لئے مصری حکام یا دولتِ عثمانیہ کے ارباب حل و عقد کو بلبل شادی کے اسیر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اس لئے کہ اگر وہ خاموش تھا تو اس کے پھیلے ہوئے شاگرد اسی جوش و خروش سے اور اسی عزم و حوصلہ سے اس کی باتوں کو دوہرا رہے تھے اور لوگوں کے دلوں کو گرما رہے تھے۔ یہاں یہ مسئلہ ہے کہ افغانی کی بدولت عربی نثر نگاری کو کیا ملا تو اس سوال کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ افغانی نے عربی زبان کے ظاہر و باطن میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کی جہاں انھوں نے اس کو نئے نظریات و افکار سے آشنا کیا وہیں انھوں نے اس کی بگڑی ہوئی شکل کی اصلاح کی کیونکہ عباسی دور تک جو عربی نثر میں غیر معمولی ارتقاء ہوا تھا آہستہ آہستہ اس کی شکل بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور انیسویں صدی تک اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ مکالمے اور محادثے، خطابت و کتابت، ذاتی رسائل و خطوط اور یہاں تک کہ سرکاری فرمانوں کی زبان معمہ بن کے رہ گئی تھی جس میں ایک جملہ کا دوسرے جملہ سے نہ کوئی ربط ہوتا اور نہ ان میں کوئی بات یا فکر ہوتی۔ بلکہ مسجع اور مقفیٰ انداز میں لکھنا اس وقت باعث افتخار تھا۔ اور یہ زبان جس میں فن تنقید اور فصاحت و بلاغت کا عظیم سرمایہ تھا لوگوں کو ان سے استفادہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور بات یہاں تک پہنچی تھی کہ مسجع اور مقفیٰ عبارتوں میں نحو و صرف کی بھی غلطیاں ہوتیں۔ افغانی کی تحریروں، ان کی تقریروں، ان کے مجلسی مکالموں

نے اس طریقہ کو ختم کیا اور ان کی بدولت صحیح اور سنجیدہ طریقۂ تعبیر وجود میں آیا اور خاص طور سے ان کی تقریروں کا نوجوانوں کے ذہن پر بڑا گہرا اثر تھا اور "العروۃ الوثقیٰ" کے مضامین جن کا انداز عالمانہ کم، خطیبانہ زیادہ تھا، ان کی بدولت جہاں ذہنوں کے جمود ختم ہوئے وہیں عربی نثر نگاری میں طاقت و توانائی پیدا ہوئی۔

جمال الدین افغانی کا تصنیفی اور تالیفی سرمایہ بہت زیادہ نہیں ہے لیکن ان کا ہر شاگرد ہزار تصنیفوں پر بھاری ہے اور جن میں مصر کے ہونہار فرزند شیخ محمد عبدہ ہیں جن کی بدولت افغانی کے افکار کا تسلسل باقی رہا اور ان کی زبان و ادب کے اصلاحی ثمرات عبدہ کی تحریروں پر پوری طرح نمایاں ہیں:۔

شیخ محمد عبدہ:۔ جمال الدین افغانی نے جہاں اپنی تقریروں اور تحریروں سے دنیائے اسلام پر احسان کیا وہیں ان کی دور اندیش نگاہوں نے ایسے اشخاص کو اپنے سے قریب کیا جنہوں نے ان کی فکر و فلسفہ، عزم و حوصلہ ان کے ایثار و قربانی کو صرف اپنا ہی نہیں بلکہ اس کے داعی اور مبلغ بن گئے۔ انھیں عظیم شخصیتوں میں شیخ محمد عبدہ ہیں۔ جب شیخ جمال الدین افغانی کو ۱۸۷۹ء میں مصر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تو انھوں نے وادی کے عوام کو غمناک نگاہوں سے الوداع کہا لیکن ان کے عزم و حوصلہ میں کوئی بھی فرق نہیں آیا کیونکہ جس بیج کو اس زرخیز زمین میں ڈال چکے تھے وہ کل شاندار باغ و بہار پودوں کی شکل میں رونما ہوں گے۔ سب سے زیادہ ان کو اطمینان اور بھروسہ اپنے لائق اور مخلص شاگرد اور دوست شیخ محمد عبدہ پر تھا۔ انھوں نے عوام سے الوداع ہوتے ہوئے یہ کلمات فرمائے۔

"لقد ترکت لکم الشیخ محمد عبدہ وکفی بہ عالماً"

ایک کامیاب استاد کا کسی شاگرد کے بارے میں یہ کہنا صرف اس کے لئے باعثِ فخر نہیں تھا بلکہ ساری قوم کے لئے نوید مسیحا تھا۔ استاد و شاگرد میں سن و زمانہ کا بہت زیادہ

فرق نہیں تھا۔ ۱۸۷۱ء میں جب جمال الدین افغانی مصر آئے اس وقت شیخ عبدہ کی عمر تقریباً بائیس سال کی تھی اور افغانی بتیس سال کے تھے۔ اس طرح اُستاد شاگرد میں دس سال کا فرق تھا۔ بائیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے شیخ محمد عبدہ ابتدائی تعلیم جو جامعۂ احمدی میں ہوئی تھی اور اعلیٰ تعلیم جو جامعۂ ازہر میں ہوئی تھی، مکمل کر چکے تھے۔ ابتدائی مرحلہ میں انھیں شیخ درویش جیسا ذہین اور درویش صفت استاد ملا اور اعلیٰ مرحلہ میں انھیں جامعۂ ازہر میں حسن الطویل جیسا مربی اور مشفق استاذ نصیب ہوا جو اپنی علمی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اسلامی حمیت اور قومی غیرت میں ضرب المثل تھے۔ ان دونوں استادوں کے علاوہ عبدہ کو جتنے بھی اساتذہ ملے وہ نہ تو ان کے علم اور نہ اُن کے طریقۂ تعلیم و تدریس سے مطمئن تھے بلکہ وہ لمحات جو ان کے حلقوں میں انھوں نے گذارے تھے ان کو وہ ضیاع وقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ عبدہ نصاب کی محدود کتابوں کے علاوہ ان کتابوں کو بھی پڑھتے جن کا اسلامی تہذیب و تمدن پر گہرا اثر رہا ہے اور خاص طور سے تاریخ، ادب، فلسفہ اور تاریخ فلسفہ ان کا پسندیدہ مضمون تھا۔ اور بعض فرانسیسی کتابیں جن کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا ان کو بھی انھوں نے پڑھا مثلاً: فرانسیسی مؤرخ کی کتاب History of Culture & Civilization in Europe (تاریخ المدنیۃ ــــ) ان کتابوں کے مطالعہ کی بدولت عبدہ میں علوم سے لگاؤ اور شغف پیدا ہوا اور جب انھوں نے تعلیم و تدریس کے میدان میں قدم رکھا تو کامیاب مدرس اور معلم ثابت ہوئے۔ ابھی ان کا علمی اُٹھان ہی تھا کہ ان کا تعارف شیخ جمال الدین افغانی سے ہوا جو اپنے وطنِ عزیز سے ہجرت کر کے آئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے سر پر کفن باندھ کر نکلے ہیں۔ وہ ایک قلندر اور درویش کے بھیس میں تھے لیکن شجاعت، ہمت، غیرت و حمیت کا یہ عالم تھا کہ سلاطین و امراء سے بھی آنکھیں ملا کر باتیں کرتے بلکہ وہ افغانی کے جلالی کے سامنے خاموش ہو جاتے۔ شیخ عبدہ نے افغانی کے اس جوہر کو تاڑ لیا اور ان کی رفاقت کو اپنے لئے باعثِ فخر

سمجھا اور ایک سعادتمند طالب علم کی حیثیت سے انھوں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ افغانی نے شیخ عبدہ کو پڑھایا نہیں بلکہ ان کے چھپے ہوئے جوہر کو اجاگر کر دیا اور اپنی مقناطیسی طاقت سے ان کو متحرک بنا دیا۔ اس کا اظہار شیخ عبدہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"میں اپنے والد ماجد کی بدولت عالمِ وجود میں آیا۔ جہاں میرے دوسرے دونوں بھائی علی اور محروث میری زندگی میں شریک ہیں لیکن جمال الدین افغانی کی بدولت مجھے جو زندگی ملی، اس کی بدولت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عیسیٰ ؑ اور حضرت موسیٰ ؑ اور دوسرے اولیاء اللہ کے زمرہ میں شامل ہوگیا۔"

شیخ عبدہ نے جو کلمات اپنے استاذ کی شان میں کہے ہیں ان کے ایک ایک لفظ میں تاریخ مضمر ہے یہاں ہم یہ بات پیش کرنے کی کوشش کریں گے کہ چھپن سال کی زندگی میں شیخ عبدہ نے کیا کیا اور اُن کے علمی اور ادبی سرمایہ کی کیا اہمیت اور نوعیت ہے کیونکہ جدید دور میں وہ افغانی کے سلسلہ کی سب سے زیادہ مضبوط کڑی ہیں شیخ عبدہ اپنی چھپن سالہ زندگی میں جدید دور میں بحیثیت معلم، مفتی، قاضی، ماہر تعلیم، صحافی، سیاسی، مفکر منظر عام پر آئے اور ہر میدان میں ان کی امتیازی شان تھی۔ افغانی کی فکر کی بنا پر وہ سیاست کے میدان میں بھی آئے اور بظاہر سیاسی میدان میں انھیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس کا اظہار انھوں نے بارہا اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ ان کی رائے میں ایک سیاسی، عوام کے جذبات کو بھڑکا تو ضرور سکتا ہے لیکن عوام کے جذبات پر قابو حاصل کرنا یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ انھوں نے مصر کے مشہور انقلابی لیڈر عرابی پاشا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ان کی خطیبانہ شخصیت نے مصری عوام کو شعلۂ جوالہ بنا دیا تھا لیکن ان کی انقلابی تحریک کی ناکامی کے بعد عوام جس بیکسی اور بے بسی کا شکار ہوئے اور سارے ملک میں جو افراتفری کی فضا پیدا ہوئی۔ شیخ عبدہ کے سامنے یہ مناظر پوری طرح تھے۔ اس لئے انھوں نے یہ طے کیا کہ خطیبانہ انداز کے بجائے اب مدبرانہ تعبیر۔ یہ ملک کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ہوگی۔ اور

سیاسی الفاظ کے استعمال کے بجائے عوام کو علم و معرفت کی راہ پر لگانا، یہ ان کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے جمال الدین افغانی کے اس طریقہ کو اپنایا جس کو انھوں نے ایک معلم کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ وہ ادب و ثقافت کے ان مسائل کی طرف آگے بڑھے جو پوری قوم کی ذہن سازی میں یا شخصیت سازی میں معاون اور ممد ہو سکتے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے لوگوں کے سامنے آباو اجداد کے علمی سرمایہ اور کارناموں کو پیش کرنا شروع کیا جن کو وہ قومی ترقی میں بنیاد سمجھتے تھے کیونکہ ان کے بغیر زبان و بیان کا معیار اعلیٰ نہیں ہو سکتا تھا پہلے انھوں نے خود ان رفیع سرمایوں کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد ان کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس سلسلہ میں "نہج البلاغۃ" "مقامات بدیع الزماں ہمدانی" کی تصحیح کر کے مطبع کے حوالہ کیا۔ اور اس کے بعد اپنے شاگردوں کو زمخشری کی تفسیر الکشاف، امام غزالیؒ کی تمام تصانیف، ابن تیمیہ اور ابن قیم کی مؤلفات کو پڑھنے کے لئے کہا۔ یہ عبدہ کا سب سے بڑا جدید دور میں کارنامہ ہے کیونکہ وہ صرف راستہ ہی نہیں بتلاتے تھے بلکہ خود چراغ لے کر آگے آگے چلتے تھے ادھر ہر لمحہ ان کی ذات سے لوگوں کو نئی نئی چیزیں میسر ہوتی تھیں۔ شیخ عبدہ نے اپنے استاد کے مقابلہ میں زیادہ لکھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مصر کے رہنے والے تھے، عربی ان کی مادری زبان تھی، ریاستی ہنگاموں کے باوجود انھیں اپنے کتب خانہ میں لکھنے پڑھنے کے زیادہ مواقع میسر تھے۔ صرف کچھ عرصہ تک عرابی تحریک میں شرکت کے بعد ملک بدر کر دیے گئے تھے لیکن ان دنوں میں بھی ان کے لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کا سلسلہ جاری تھا۔ دوسرے مشرق اور مغرب کے بہت سے ممالک کو انھیں قریب سے دیکھنے کے مواقع میسر ہوئے فرانس سوئٹزرلینڈ انگلستان، دولتِ عثمانیہ کے اکثر و بیشتر مقامات، ادھر تونس اور سوڈان کو دیکھنے کا موقع ملا۔ عبدہ نے مختلف ممالک کے دوروں سے بہت کچھ سیکھا جس سے بعد میں ساری قوم مستفیض ہوئی۔ انھوں نے اپنے علمی تجربوں کو یا اپنے عینی مشاہدات کو مقالات اور مضامین کی شکل میں پیش کیا اور اس طرح عربی نثر میں وقیع اور سنجیدہ نثر نگاری کی بنیاد پڑی جس میں

تجربات ومشاہدات دونوں کے عنصر پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں اور عربی نثر نگاری کا کارواں جو افغانی کی بدولت حرکت میں آیا تھا۔ عبدہ نے اپنی ذہنی اور فکری صلاحیت سے اس کو تیز گام کر دیا۔ عبدہ کی تحریریں چار طرح کی ہیں:

(۱) مستقل تصنیفی شکل میں۔

(۲) مضامین اور مقالات کے مجموعہ کی شکل میں۔

(۳) خطبات اور مکالمات کی شکل میں، اور

(۴) کلام مجید کی تفسیر کی شکل میں۔

تصنیف کی شکل میں ان کی کتاب رسالۃ التوحید، سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کتاب میں امام غزالیؒ۔ ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن خلدون اور سیرت کی کتابوں کی فکر، کتاب کی ہر سطر میں جلوہ گر ہے۔ اس میں ان کا اندازِ بیان بڑا عالمانہ اور متکلمانہ ہے۔ عبارت میں خشکی نہیں بلکہ زندگی اور حرکت ہے اور عربی نثر میں اس طرح کا مجموعہ صدیوں بعد منظرِ عام پر آیا۔

جہاں تک ان کے مقالات ومضامین کا تعلق ہے۔ کچھ تو الوقائع المصریۃ جو تقریباً سرکاری جریدہ تھا اور کچھ العروۃ الوثقیٰ، میں چھپے تھے الوقائع المصریۃ کا اندازِ بیان بڑا سنجیدہ اور شگفتہ ہے جس میں دور بینی کے ساتھ ساتھ مصلحت بینی بھی پیشِ نظر رکھی گئی ہے لیکن العروۃ الوثقیٰ کے مضامین میں شعلہ بیانی ہے کیونکہ اس میں ان کے استاد محترم کی صحبت کا بڑا دخل ہے۔ اور دوسرے پیرس کے دورانِ قیام ان مقالات کو انھوں نے لکھا تھا جہاں وہ شمشیر برہنہ تھے ان پر کسی کا خوف تھا اور نہ ڈر بلکہ جذبات کے طوفان میں خود بہہ رہے تھے اور یہ چاہ رہے تھے کہ دنیا کے ہر خطہ کے مسلمانوں کے اندر ہمت وحوصلہ پیدا ہو اور وہ موجوں کے تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ موجوں سے کھیلنے والے بن جائیں۔

اسی طرح ان کی تقریریں بھی جذباتی ہوتی تھیں۔ اس میں عبدہ کے مزاج سے زیادہ خود عربی زبان کے مزاج کا دخل ہے کیونکہ عرب خطابت کو خطابت اس وقت تک نہیں مانتے تھے جب تک کہ اس میں جوش وخروش نہ ہو۔ اس طرح انھوں نے افغانی کے بعد فن خطابت کو بھی آگے بڑھایا۔

جہاں تک ان کی تفسیر کا تعلق ہے جو علامہ رشید رضا کے رسالہ المنار میں قسط وار چھپتی رہی ہے۔ عبدہ اپنی اس تفسیر میں اپنی خاص خصوصیت کے حامل ہیں۔ وہ متقدمین مفسرین کے مقلد نہیں بلکہ ان کے بہت سے نظریات پر تنقید بھی کرتے ہیں اور دوسرے کلام پاک کے ادبی اعجاز جس میں انسانی فکر کے مختلف مراحل کا بھی پاس رکھا گیا ہے۔ شیخ عبدہ عصری تقاضوں کے تحت کلام پاک کے آیات کی تفسیر اور اس کے اعجاز کی توضیح بڑے سادہ اور علمی انداز میں کرتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے جدید دور میں فن تفسیر کو جو نئے انداز میں پیش کرنے کی پہل کی وہ بعد میں آنے والے مفسرین کے لئے مشعل راہ بنی۔ اس طرح عبدہ کے عزم و حوصلہ، فکر و تدبر، ذہانت و ذکاوت کی بدولت عربی نثر نگاری ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بڑھی اور یہ منزل پہلی منزل کے مقابلہ میں زیادہ طویل تھی۔ عبدہ کا یہ علمی تسلسل رکا نہیں بلکہ ان کے ہونہار شاگردوں نے اس کو اور آگے بڑھایا بلکہ اس میں جدید فکر و فلسفہ کی آمیزش سے نکھار پیدا کیا۔ اس کے بعد ہم اس دور کے دوسرے مفکر، ادیب، ماہر نفسیات عبدالرحمٰن الکواکبی کی تحریروں کا جائزہ لیں گے جو عبدہ کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عبدالرحمٰن الکواکبی: جدید عربی نثر نگاری کے معماروں میں عبدالرحمٰن الکواکبی کی شخصیت کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ۱۸۴۸ء میں شام کے مشہور اور مردم خیز شہر حلب میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان شام کے معزز اور علمی خاندانوں میں شمار ہوتا تھا اور اسی خاندان میں حلب کے نقابۃ الاشراف، جو اس زمانہ میں

اعلیٰ خاندانوں کا طرۂ امتیاز تھا، حلب کی جامع مسجد سے ملحق مشہور مدرسہ المدرسۃ الکواکبیۃ ۱۰ھ کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم ہوئی تھی۔ اس زمانہ کے اکثر و بیشتر مدارس خواہ وہ مصر میں ہوں یا شام میں ان سب پر جامعۂ ازہر کے نصاب تعلیم کی چھاپ ہوتی تھی کواکبی کی ماں کا ان کے بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ ماں کی قائم مقامی ان کی خالہ نے کی اور ایسی تربیت کی کہ کواکبی کو ماں کی کمی کا احساس کبھی نہیں ہوا۔ وہ ایک شائستہ اور پڑھی لکھی خاتون تھیں اس لئے کواکبی کو ان کی آغوش میں جہاں ماں کا پیار ملا وہیں علم و ادب کا ذوق و شوق انھیں کے سایہ میں پیدا ہوا۔ کواکبی کے خاندان کو جہاں قدرت کی طرف سے جاہ و جلال، عزت و شرف عطا ہوا تھا وہیں اس خاندان میں ذہانت و ذکاوت بھی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ یہ اعلیٰ قدریں کواکبی کو ورثہ میں ملیں اور جس کو انھوں نے امت مسلمہ کے مسائل پر غور کرنے اور سوچنے میں لگایا۔ شام کا علاقہ دولت عثمانیہ کے ماتحت تھا اور جب دولت عثمانیہ میں سیاسی اور ثقافتی زوال شروع ہوا تو اسکے اثرات دولت عثمانیہ کے ان تمام علاقوں میں رونما ہونا شروع ہوئے۔ اس میں عربی اور ترکی بولنے والوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ عوام اور خواص ظلم و استبداد کے شکار تھے، حق و انصاف کا مطالبہ یا اس کے لئے کوئی تحریک اٹھانا حکومت کے خلاف بغاوت پر محمول کیا جاتا تھا۔ کواکبی کو خدا نے زندہ دل عطا کیا تھا۔ اور انھیں غیر معمولی حساس بنایا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی قوم کی زبوں حالی کو نہیں دیکھ سکتے تھے بلکہ اس کو پستی سے نکالنے کی راہیں تلاش کرتے قومی زبوں حالی کے جو اسباب تھے ان کے ازالہ کی صورتیں پیش کرنے لگے۔ ترکی حکام نے ان کے مشوروں پر عمل کرنے کے بجائے انھیں باغی اور نافرمان قرار دیا چنانچہ حلب شہباد کے اس فرزند نے پریشان اور مجبور ہو کر شام سے ہجرت کی اور مصر میں پناہ لی۔ شام کے وہ نوجوان جو سیاسی اور سماجی تحریکوں میں شریک رہتے ان پر دولت عثمانیہ کے حکام کوئی نہ کوئی ضرور الزام لگا دیتے اس لئے اپنے وطن سے راہِ فرار کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا اور مصر میں انھیں اس لئے پناہ مل جاتی کہ ۱۸۸۲ء کے بعد یہ انگریزوں کے ماتحت

تھا جن کی پالیسی یہ تھی کہ دولتِ عثمانیہ کے تمام علاقوں میں انتشار اور خلفشار کی فضا پیدا ہو اور خلافت کا یہ آخری رمز بھی ختم ہو جائے جس سے زیادہ تر دنیا کے مسلمانوں کی گہری عقیدت وابستہ ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ وہاں کے حکام اس خطرہ سے بے خبر تھے اور دوست و دشمن کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھے تھے۔ کواکبی اور ان کی طرح دوسرے مفکرین کی دلی خواہش تھی کہ خلافتِ عثمانیہ کے زیر سایہ تمام ممالک میں امن و امان کی فضا قائم ہو اور لوگوں میں علم و ثقافت کا چرچا ہو لیکن کواکبی جیسے مخلص مفکر اور مدبر کی نصیحتیں بجائے ان کو صحیح راہ پر لانے، ان کا اثر الٹا ہوا اور عام طور سے جب کسی ملک کا سیاسی زوال ہوتا ہے تو حکام حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتے ہیں۔ کواکبی نے اپنے رسالہ 'الشہباء' میں مکمل مسائل پر جو تبصرے لکھے ان میں سیاسی رنگ کے بجائے علمی رنگ زیادہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن حالات اور جس ماحول میں کواکبی کی نشوونما ہوئی وہاں سیاست کے بجائے علم و ادب کا چرچا زیادہ تھا۔ مصر آنے کے بعد بھی جہاں وہ دولتِ عثمانیہ کے حکام کے چنگل سے آزاد تھے وہاں بھی وہ سیاست کے بجائے علماء اور علمی حلقوں سے وابستہ رہے اور وہاں کے جرائد و رسائل میں قوموں کے عروج و زوال کا جس عالمانہ اور فاضلانہ انداز میں اپنے نظریات کو پیش کیا یہ جدید عربی زبان و ادب میں بالکل نئے اور نرالے تھے۔ جن کو مصر کے علمی حلقوں میں بے حد سراہا گیا اور اس کی بدولت وہ شیخ محمد عبدہ سے قریب ہو گئے اور ان سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ ان کے مقالات اور مضامین کے مجموعے دو کتابوں کی شکل میں منظرِ عام پر آئے۔ پہلا مجموعہ طبائع الاستبداد اور دوسرا مجموعہ ام القریٰ کے نام سے شائع ہوا۔

پہلی کتاب میں انھوں نے قوموں کے سیاسی، سماجی، مذہبی عروج و زوال پر عالمانہ اور حکیمانہ انداز میں بحث کی ہے۔ ان کی فکر کا محور یہ ہے کہ دنیا میں جس چیز نے قوموں

کے اخلاق و کردار، ان کے ذہن و فکر اور قلب و جگر پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ وہ ہے 'غلامی' اور غلامی کے لوازمات حکومت کا ظلم و استبداد ایک ایسی لعنت ہے جس نے جہاں قوموں کی ذہنی سطح کو نیچا کیا ہے وہیں اس نے ان کے اطوار و کردار کو بالکل بدل دیا ہے اور جھوٹ نفاق، بزدلی، ایک دوسرے کے خلاف سازش، کینہ، حسد، بغض جیسی مہلک اور خطرناک خصلتیں پیدا کی ہیں۔ اور یہ خرابیاں زیادہ تر ایسی سوسائٹی میں بڑھتی یا پروان چڑھتی ہیں جہاں لوگ اظہارِ رائے سے محروم ہوں اور ظلم و جور کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں۔ آہستہ آہستہ یہ تمام خرابیاں ان قوموں کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہیں۔ عبدالرحمٰن الکواکبی نے اپنے ان افکار و نظریات کے لئے جو زبان و بیان استعمال کی ہے وہ بہت ہی واضح اور سلیس ہے۔ بلکہ بڑی حد تک اندازِ بیان ادیبانہ ہے جس میں وہ بسا اوقات شیخ محمد عبدہٗ سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ عربی زبان کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ حلب کا ہونہار نوجوان مصری علماء و مفکرین کے شانہ بشانہ اس طرح چل رہا ہے کہ گویا وہ اپنے وطنِ عزیز میں ہے اور وہاں کے عوام نے اس کا جس انداز میں خیر مقدم کیا وہ بھی اپنی جگہ اہم واقعہ ہے۔

دوسری کتاب 'ام القریٰ' یہ کتاب ڈرامائی اور افسانوی انداز میں مرتب کی گئی ہے۔ اس میں کواکبی ایک پارلیمنٹ بناتے ہیں اور اس میں مختلف علاقوں کے منتخب ممبران ہیں پارلیمنٹ میں مختلف مسائل زیرِ بحث ہیں جن میں زیادہ تر اسلامی ملکوں کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات ہیں اور مسلمانوں کو پستی سے نکالنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے ذرائع و وسائل کی تلاش بھی ہے۔ ہر ممبر بڑی آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور آخر میں دو اہم فیصلے ہوتے ہیں وہ یہ کہ خلافت ترکوں سے نکل کر عربوں کو ملنی چاہیئے اور اس کا مرکز دنیا کے سب سے مقدس اور معظم مقام مکہ معظمہ ہونا چاہیئے۔ اس طرح کواکبی نے بڑی ہوشیاری سے ترکوں کے خلاف علمِ بغاوت اٹھایا۔ اس کتاب کا اندازِ بیان پہلی کتاب کے مقابلہ میں زیادہ رواں اور دواں ہے کیونکہ پوری کتاب کا دارومدار مکالمہ اور محادثہ پر قائم ہے۔